نے ان کو متعدد خطوط میں حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے رہنے کی ہدایت فرمائی "اس کی وجہ حضرت مفتی صاحب کی جلالتِ شان کے ماسوا سلسلۂ طریقت کا اشتراک اور مناسبت بھی تھی، والد ماجد نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "نزہتہ الخواطر" کی (جو آٹھ جلدوں میں عربی میں غیر منقسم ہندوستان کے ہزار بارہ سو سال کے اسلامی دور کے مشاہیر ہند اور ممتاز شخصیتوں کے تعارف و تذکرہ پر مشتمل ہے آٹھویں جلد میں حضرت مفتی صاحب کا بلند الفاظ میں قدرے شرح وبسط کے ساتھ تذکرہ کیا ہے۔ مجھے حضرت مفتی صاحب کی زیارت کا شرف تو حاصل نہیں ہوا، کہ سنہ ۱۳۴۷ھ میں آپ کی وفات ہوگئی، اور میں دیوبند ۱۹۳۱ء (سنہ ۱۳۵۰ھ) میں حاضر ہوا، اور مولانا مدنی رحمۃ اللہ کے درس حدیث میں شرکت کی سعادت حاصل کی، دیوبند کے ایک سفر کے موقعہ پر مفتی صاحب کے عم محترم مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ دیوبند ہی تشریف رکھتے تھے، مولانا مدنیؒ کے دولت کدہ پر ان سے نیاز حاصل ہوا، پھر کئی بار دولت خانہ پر بھی حاضر ہوا، مولانا کے ان حواشی کے بارے میں جو حضرت شیخ الہند کے ترجمۂ قرآن پر ان کے قلم سے ہیں، میں نے اپنے تاثرات اور بحیثیت مدرس تفسیر کے اپنے تجربہ کا اظہار کیا۔ اور ان کی افادیت اور علمی وتحقیقی امتیاز کے بارے میں اظہار خیال کیا، تو مولانا کی خصوصی توجہ ہوئی اور خصوصی شفقت فرمانے لگے، اس وقت تک جہاں تک یاد ہے مفتی عتیق الرحمٰن صاحب سے ملاقات اور تعارف کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

مفتی صاحب کے نیاز اور براہ راست ملاقات کا سلسلہ (جہاں تک حافظہ کام کرتا ہے) سنہ ۱۹۴۴ء کے بعد سے شروع ہوا، جب حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ کی خدمت میں پہلی بار حاضری ہوئی اور پھر مستقل ربط قائم ہو جانے کی بنا پر تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد دہلی کا سفر پیش آتا رہا، اس وقت تک دہلی کے نامور اور ممتاز علماء اور علمی اشتغال اور سیاسی ذوق رکھنے والے فضلاء (حضرت مفتی کفایت اللہ

صاحب رح کو مستثنیٰ کرکے) مولانا سے زیادہ متعارف و مانوس نہیں تھے۔ اوران کی نظام الدین کے تبلیغی مرکز میں آمد و رفت شروع نہیں ہوئی تھی، میں اپنی بے بضاعتی اور کم مائگی کے باوجود دارالعلوم ندوۃ العلمار سے درس و تدریس کا انتساب رکھنے اور کچھ لکھنے پڑھنے کی مناسبت سے دہلی کے ان علمار اور مولانا کے درمیان رابطہ بننے کی کوشش کرتا تھا۔ اُسوقت جامع مسجد پر مولانا سمیع اللہ صاحب مرحوم کا مکتبہ عزیزیہ باذوق وسنجیدہ علمار اور علمی وسیاسی ذوق رکھنے والے احباب کی (جن کا زیادہ تر جمعیۃ العلمار سے تعلق تھا) نشست گاہ اور بزم احباب تھی، مولوی سمیع اللہ صاحب کے اخلاق، خوش گفتاری اور زندہ دلی کی وجہ سے میری بھی آمدورفت شروع ہوئی، وہاں مفتی صاحب اور مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی بھی تشریف لایا کرتے تھے، میں نے دونوں کو نظام الدین آنے کی دعوت دی، اور دونوں حضرات میری دعوت پر وہاں تشریف لائے، میں نے مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مفتی صاحب کے بارے میں یہ بلند الفاظ سُنے تھے، فرماتے تھے کہ "حضرت مفتی عزیزالرحمٰن صاحب کو مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کی فقہی صلاحیت اور نظر پر بڑا اعتماد تھا، اور وہ ان کے فقہی جوابات سے مطمئن ہوتے تھے، مجھے ان کا فقہ و افتار کے علاوہ کسی اور چیز میں مشغول ہونا، اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ ان کو اس فن سے خصوصی مناسبت اور امتیاز حاصل ہے"۔

مفتی صاحب سے اصل ربط و تعلق ۱۹۴۴ء سے شروع ہوا، اس وقت ندوۃ المصنفین، قرولباغ دہلی میں تھی حسنِ اتفاق کہ اس زمانہ میں اس کے مرکز کے قریب ہی میرے والد مرحوم کے ایک مخلص دوست عم مخدوم و محترم الحاج سید محمد خلیل صاحب سنہٹوری مرحوم مقیم تھے، ان کے صاحبزادۂ گرامی قدر برادر محترم سید محمد جمیل صاحب (جو بعد میں پورے پاکستان کے اکاؤنٹینٹ جنرل ہوئے) ریلوے کے آڈیٹر تھے اور ایک زمانہ میں دہلی میں انکی پوسٹنگ تھی، اس تعلق و مناسبت سے میرا بار بار وہاں

آنا جانا ہوتا تھا، سید محمد خلیل صاحب اور سید محمد جمیل صاحب دونوں مفتی صاحب اور مولانا سعید احمد صاحب اور ندوۃ المصنفین سے ربط و تعلق رکھتے تھے، اسی زمانہ میں مولانا محمد سلیم صاحب ناظم مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ جو حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی بانی مدرسہ و مصنف "اظہار الحق" کے خاندان کے چشم و چراغ اور "آثار رحمۃ اللہ" میں سے تھے، بعض سیاسی حالات و مصالح کی بنا پر مکہ مکرمہ سے آکر قرولباغ دہلی میں اسی ماحول و جوار میں جس کا تذکرہ کیا گیا مقیم تھے، یہیں سے وہ رسالہ "ندائے حرم" کی ادارت و اشاعت بھی فرماتے تھے۔ اور مدرسہ صولتیہ کی رہنمائی و نگرانی بھی، اتفاق سے انھیں دنوں ہمارے مخدوم مولوی ظہیر الحسن صاحب کاندھلوی ایم۔ اے علیگ بھی دہلی میں مقیم تھے اور ان کا زیادہ وقت یہیں گزرتا تھا، وہ مجھ پر خاص کرم فرماتے تھے، اور مجھے بھی ان سے بڑی موانست و مناسبت تھی، میں قرولباغ جاتا تو آدھے دن رہ جاتا، علم و ادب، زندہ دلی اور مجلس آرائی، چشم و گوش اور کام و دہن سب کی لذّت سب کا سامان ایک جگہ بہم ہوتا مفتی صاحب اور مولانا سعید احمد صاحب بھی شریکِ بزم ہوتے، انھوں نے کبھی اپنی قیام گاہ پر بلا کر کھانے کی ضیافت بھی فرمائی۔

اس کے بعد مفتی صاحب سے صرف اہم اجتماعات میں ملاقات ہوتی، مثلاً بمبئی کا تعلیمی کنونشن جو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے ۱۹۵۵ء میں بلایا تھا تقسیم ہند کے بعد جمعیۃ العلماء کا پہلا جلسہ جو ۱۳۶۷ھ (اپریل ۱۹۴۸ء) میں مولانا مدنیؒ کی صدارت میں لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا۔ اور اس کے اکثر مہمان دار العلوم ندوۃ العلماء میں مقیم تھے نومبر ۱۹۵۳ء میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کا پاکستان میں حادثہ ارتحال پیش آیا۔ دار العلوم ندوۃ العلماء میں ہم نیازمندوں نے مولانا کی یاد میں ۱۹۵۴ء میں ایک سنجیدہ اور علمی اجتماع منعقد کیا جس کی شرکت کے لئے ضعف و علالت کے باوجود مولانا سید

مناظر احسن صاحب گیلانی مرحوم اپنے وطن سے لکھنؤ تشریف لائے مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب اپنی شرافتِ نفس، سیّد صاحب کے ساتھ تعلقات، اور دارالمصنفین ندوۃ المصنفین کے علمی و رسمی رشتہ و اشتراک کی بنا پر کیسے شرکت نہ فرماتے؟ تشریف لائے اور بڑے ذوق و دلچسپی کے ساتھ پورے اجتماع میں شریک رہے، سیّد صاحب کا ہندوستان کو خیر باد کہہ کر پاکستان تشریف لے جانا اور وہیں قیام اختیار کر لینا ایک علمی ادبی اور ملّی سانحہ تھا، لیکن حالات اور مجبوریوں اور خانگی نزاکتوں کی "سنگین منطق" میں دخل در معقولات،، کی کیا گنجائش؟ مفتی صاحب نے اپنے ہی تأثر نہیں بلکہ ہندوستان کی، ملّتِ اسلامیہ اور علمی و تصنیفی اداروں کی اس ملی جُلی حیرت و حسرت کو جس خوبی ذہانت و لطافت کے ساتھ اپنی تعزیتی تقریر میں ادا کیا وہ مفتی صاحب ہی کا حق تھا، اور ذوق و گوش ابھی تک اس کی لذت لے رہے ہیں، مفتی صاحب نے فرمایا کہ "ہم عقیدت مندوں اور نیازمندوں کی تمنّا تو یہ تھی کہ سیّد صاحبؒ کی آخری آرام گاہ یا اپنے محبوب و محسن استاد و مُربّی علّامہ شبلیؒ کے پہلو میں ہوتی، یا اپنے مرکزِ عقیدت شیخ و مرشد حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے پہلو میں، مگر تقدیرِ الٰہی کچھ اور تھی ؎

من چناں خواہم، خدا خواہد چنیں

آج بھی اہلِ ذوق اور محرمانِ حقیقت اس بلیغ جملہ کا لطف اٹھا سکتے ہیں جس میں مرثیہ کا سوز بھی ہے اور غزل کی لطافت بھی ویسے تو مفتی صاحب کی رفاقت دارالعلوم دیوبند کے جلسہ شوریٰ میں اور ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی میں حاصل ہوتی رہتی تھی لیکن اصلاً مفتی صاحب کی رفاقت اور وسیع و جامع معنی میں خدمتِ دین و ملت کے میدان میں ہم سفری کی سعادت ۱۹۶۴ء سے حاصل ہوئی۔

جب راؤرکیلا، رانچی، جمشید پور کے فسادات نے ملت کا درد رکھنے والوں اور ہندوستانی مسلمانوں کے رہنماؤں اور کارکنوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور یہ صاف نظر آنے لگا کہ اگر

بروقت اس کا مداوا نہ کیا گیا اور مسلمانوں کی مختلف سیاسی جماعتوں، تنظیموں، اور ان کے قائدین رہنماؤں نے ملت ہی کو نہیں بلکہ ملک کو بچانے کے لئے منظم و متحد جد و جہد کا آغاز اور مشترک پلیٹ فارم کو وجود میں لانے کا کام نہ کیا تو اس ملت پر جو کچھ گذرے گی سو گذریگی ملک کی بھی خیریت نہیں، اس تأثر کا سب سے زیادہ غلبہ اور اس صدمہ کی چوٹ سب سے زیادہ (خدا مغفرت کرے اور ان کے درجے بلند کرے) ڈاکٹر سید محمود صاحب مرحوم کے دل پر تھی، انھوں نے ان سب فکر مند اور درد مند حضرات سے رابطہ قائم کیا جو اس سلسلہ میں ان کے ہم سفر ہو سکتے تھے، لیکن ڈاکٹر صاحب کے دہلی میں ہونے کی وجہ سے ان کا سب سے زیادہ اور پہلا ربط مفتی صاحب اور مولوی محمد مسلم صاحب ایڈیٹر "دعوت" سے رہا، باہر کے لوگوں میں راقم سطور اور مولانا محمد منظور صاحب سے

اس سلسلہ کا پہلا قدم مشاورت کا وہ تاسیسی جلسہ تھا جو ۸، ۹ اگست ۱۹۶۴ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں منعقد ہوا، اور جس کے نتیجہ میں مسلم مجلس مشاورت وجود میں آئی، اسی جلسہ میں طے پایا کہ ملک کی فضا کو درست کرنے اور احترام انسانیت اور امن آشتی کا پیغام پہونچانے اور بجائے سیاسی جماعتوں اور ان کے رہنماؤں کے (جن کے ذہن بہت کچھ مسموم ہو چکے ہیں) ملک کی عام آبادی اور ہندو مسلم عوام سے براہ راست رابطہ پیدا کیا جائے، اس کے ساتھ مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا کیجائے اور ان کو محسوس کرایا جائے، کہ وہ دین حق اور خدا کے آخری پیغام کے حامل، انسانیت کے بے لوث خادم و معمار ہونے اور اپنی ان خصوصیات اور دینی ذمہ داریوں کی بنیاد پر اس ملک کے محافظ و پاسبان بھی ہیں۔

اس سلسلہ میں پہلا سفر بہار و اڑلیسہ کا ہوا، اور ایک موقر اور متنوع الافراد وفد نے ستمبر ۱۹۶۴ء میں رانچی، چکر دھر پور، چائباسہ، جمشید پور، اور راوڑکیلا کا دورہ کیا۔ ہر جگہ وفد کا شاندار اور پر جوش استقبال ہوا، مقرروں میں ڈاکٹر صاحب

کے بعد مفتی صاحب پیش پیش اور نمایاں ہوتے تھے۔ نومبر ۶۴ئ میں مجلس نے مہاراشٹر کا دورہ کیا، دسمبر ۶۴ئ میں گجرات کا دورہ ہوا۔ جسمیں پنڈت سندر لال بھی شریک تھے اس سفر میں پالن پور، احمد آباد، نڈیاڈ، گودھرا، بڑودہ، سورت اور بھڑوچ پر یہ پروگرام اختتام کو پہونچا، گجرات کے دورہ کا ذکر آگیا ہے تو دو واقعات کے تذکرہ کئے بغیر آگے نہیں بڑھا جاتا۔

پہلا واقعہ یہ ہے کہ احمد آباد کے قریب ایک مرکزی اور اہم قصبہ میں جس کا نام (اگر حافظہ کوتاہی نہیں کرتا) بیس نگر تھا، میں نے منتظمین جلسہ اور رفقائے سفر سے درخواست کی کہ چونکہ میں کئی راتوں سے دیر میں سو رہا ہوں اور بہت تھکا ہوا ہوں مجھے تقریر کا پہلے موقعہ دیدیا جائے، ذمہ داروں نے منظور کرلیا، اور پہلی تقریر میری ہوئی میں نے اس تقریر میں ہندوستان کی جغرافیائی وسعت، تاریخی عظمت اور سیاسی اہمیت وغیرہ بیان کرنے کے بعد ایک محب وطن ہندوستانی کی حیثیت سے اس پر حسرت وقلق کا اظہار کیا کہ اتنے عظیم ملک کی قیادت اور انتظام کے لئے ملک کے آزاد ہونے کے بعد جس بالغ سیاسی شعور، وسیع النظری، سیرت و اخلاق کی بلندی اور اصول پسندی کی ضرورت تھی، اسکی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے، شاید جنگ آزادی کی مصروفیت میں قومی سیرت و اخلاق کی تعمیر کا وہ کام نہیں ہوسکا، جس کی اتنے بڑے ملک کے سنبھالنے کیلئے ضرورت تھی، ملک میں ذہنی و اخلاقی انتشار، دولت کی حد سے بڑھی ہوئی محبت اور رشوت و کرپشن پھیلا ہوا ہے، ملک کے بے لوث کارکنوں، سیاسی رہنماؤں، اور قائدین کو اسکی طرف توجہ کی ضرورت ہے، ورنہ اس آزادی کا برقرار رہنا مشکل ہوجائے گا میں یہ تقریر کرکے اپنی قیام گاہ پر آگیا، واپسی پر ملا جان صاحب نے بتایا (جو تحریک خلافت کے ایک پرانے کارکن اور مجلس مشاورت کے ایک اہم رکن تھے اور کلکتہ میں ان کا قیام تھا) کہ تمہاری تقریر پر پنڈت سندر لال جی نے سخت تنقید اور احتجاج کیا، اور کہا کہ مولانا کو اتنے

تُند اور تیز لہجے میں ہندوستان پر تنقید کرنے کا کیا حق تھا؟ انھوں نے ملک کی توہین کی خیریت ہوئی کہ مجمع نے اس پر اپنے غم و غصّہ کا اظہار نہیں کیا، مجھے یہ سُن کر تعجب ہوا کہ یہ باتیں ایک محبِ وطن ہندوستانی کے ناتے اور ملک کی خیرخواہی میں خلوص سے کہی گئی تھیں اس پر اتنا بُرا ماننے کی کیا بات تھی؟ فجر کی نماز کی تیاری کے لئے ہم سب لوگ اُٹھے تو دیکھا کہ پنڈت جی اب بھی اس تقریر پر تنقید و تبصرہ کر رہے ہیں، اور مسلمانوں کے بارے میں طنزیہ الفاظ بھی استعمال کر رہے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ مسلمان زمزم کو مقدس پانی مانتے ہیں۔ لیکن گنگا جل کی انکے یہاں کوئی عزت نہیں، وغیرہ وغیرہ میں نے طے کر لیا کہ میں اخیر تک خاموش رہوں گا۔ تاکہ سفر کے مقصد کو کوئی نقصان نہ پہونچے، اور اس وفد میں جو مختلف الخیال لوگوں پر مشتمل ہے کوئی انتشار نہ پیدا ہو، لیکن حیرت ہوئی کہ رفقائے سفر میں سے جن میں بعض خالص مسلم جماعتوں کے رہنما تھے[1] کوئی ایک لفظ نہیں بولا، اور پنڈت جی کا سلسلہ کلام جاری رہا، اتنے میں مفتی صاحب کی آواز آئی جو ابھی بیدار ہی ہو رہے تھے کہ پنڈت جی آخر مولانا نے کیا بےجا بات کہی آپ اتنے گرم کیوں ہیں الخ اس وقت مجھے مفتی صاحب کی قدر ہوئی کہ انھوں نے نہ صرف دینی حمیت بلکہ اخلاقی جرأت سے کام لیا، اور میری تائید کی، پنڈت جی اس پر خاموش ہو گئے اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

سفر گجرات کا دوسرا قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ ہم لوگ بڑودہ میں نماز فجر وغیرہ سے فارغ ہو کر بیٹھے تھے کہ چند اہل محلہ گھبرائے ہوئے آئے، اور انھوں نے کہا کہ قریب ہی ایک مکان ہے جو زمین میں دھنس رہا ہے اُس کے آثار نظر آتے ہیں کئی روز سے اس مکان کے مکین خواب دیکھ رہے ہیں کہ اس مکان میں نامناسب کام ہوئے ہیں اور انکی

---

[1] اس موقعہ پر ڈاکٹر سید محمود صاحب صدر مجلس اور مولانا ابواللیث صاحب ندوی امیر جماعت اسلامی ہند موجود نہ تھے وہ دونوں احمد آباد رہ گئے تھے۔

نحوست ہے یہ مکان زمین میں دھنس جائے گا، آپ حضرات چلیں اور وہاں دعا کریں ہم سب لوگ اپنی حقیقت سے واقف تھے "ایاز قدر خود را شناس"، لیکن یہ خیال ہوا کہ ملت کے خادموں اور مختلف مسلم جماعتوں کے نمائندوں کی جماعت ہے، اور یہ ایک نیک مقصد سے سفر کر رہے ہیں کیا عجب ہے کہ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے، اور یہ بلا ٹل جائے، کچھ نظر پڑتی تھی تو حضرت مفتی صاحب پر کہ عالم، حافظ، فقیہ اور اللہ کے ایک مقبول بندہ اور صاحب نسبت شیخ کے فرزند ہیں، ہم لوگ ہمت کر کے گئے اور وہاں کھڑے ہو کر دعا کی، اور چلے آئے، لوگوں نے بتایا کہ وہ کیفیت ختم ہو گئی۔ مکان اب بھی اسی حالت میں اس جگہ موجود ہے، محبی غلام محمد میمن صاحب سے (جن کا بڑودہ میں قیام ہے، اور مفتی صاحب سے خاص تعلق رکھتے ہیں) جب کبھی پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ الحمد للہ مکان اپنی جگہ پر قائم اور محفوظ ہے۔ مشاورت کا سب سے بڑا دورہ ریاست میسور میں ہوا، جو ۱۱ نومبر سے شروع ہو کر ۲۲ نومبر ۱۹۶۶ء کو ختم ہوا۔ اسکی مجموعی مسافت کا اندازہ ساڑھے چار ہزار میل ہے جسمیں تقریباً ڈیڑھ ہزار میل کی مسافت بس سے طے کی گئی مدراس سے شروع ہو کر یہ دورہ گلبرگہ پر ختم ہوا، جھانسی ہی سے راقم السطور کی سفر میں رفاقت ہو گئی۔ یہ تحریک خلافت کے بعد شوکت اسلامی کا پہلا نظارہ تھا، اس کے اہم مقامات میں بنگلور، سرنگاپٹن (مدفن سلطان ٹیپو) میسور، مرکارہ، منگلور، ہاسن، بیجاپور، شیموگا وغیرہ تھے۔

اس تاریخی دورہ میں اختتامی تقریر مفتی صاحب کی تھی، انھوں نے فرمایا کہ صحیح آزادی اور جمہوریت وہ ہوتی ہے۔ جس کا فیض یکساں طور پر آبادی کے تمام عناصر اور ملک کے تمام فرقوں اور طبقوں کو پہونچے، اس کی انھوں نے مثالیں دیں، اور اس سلسلہ میں مسلمانوں کو جو شکایات ہیں اس کا ذکر کیا، پھر اپنے پسندیدہ (جگر مرحوم) کے اشعار پڑھے، جو اس دورہ میں اکثر پڑھا کرتے تھے۔

بہار آئے اور اس شان کی بہار آئے ۔۔۔ کہ پھول ہی نہیں کانٹوں پہ بھی نکھار آئے

چمن چمن ہی نہیں جس کے گوشہ گوشہ میں — کہیں بہار نہ آئے کہیں بہار آئے

مفتی صاحب کی تقریروں میں رجائیت اور تعمیری وایجابی نقطۂ نظر غالب ہوتا تھا ان کی تقریریں جذبات میں اشتعال، اور غم وغصہ پیدا کرنے کے بجائے مسائل سلجھانے اور حالات کی طرف سے پُراُمید رہنے پر آمادہ کرتی تھیں، اکثر دوسرے مقررین کے مقابلہ میں ان کی تقریریں زیادہ تعمیری اور غیر مسلم سامعین کے لئے (جو اکثر مقامات پر بڑی تعداد میں ہوتے تھے) مفید اور قابل فہم اور قابل قدر ہوتی تھیں اور انکو قریب کرنے کا کام کرتی تھیں، جوان دوروں کا ایک بڑا مقصد تھا۔

افسوس ہے مجلس کی ان تعمیری سرگرمیوں اور اس کے دوروں کا مفید سلسلہ زیادہ دنوں تک جاری نہیں رہا، میسور کا دورہ مجلس مشاورت کی شہرت ومقبولیت کا نقطۂ عروج تھا، ۶۷ء کے عمومی انتخابات بلا واسطہ مجلس کے لئے اور بالواسطہ مسلمانان ہند کے لئے ایک نازک ابتلا ثابت ہوئے جماعتوں کے ذمہ داران اور ارکان مجلس نے اپنے اپنے طور پر کہیں کہیں کام کیا اور اس سے مجلس کا شیرازہ جو ابھی تک مرتب ومنظم تھا کسی قدر انتشار وتضاد کا شکار ہوا، ۲-۳- اپریل ۶۷ء کو مجلس کا جلسہ دہلی میں منعقد ہوا، ڈاکٹر سید محمود صاحب استعفیٰ پر مصر تھے، لیکن ان کو بڑی مشکل سے اس سے باز رکھا گیا لیکن اُن میں اب پہلی سی اُمنگ اور ولولہ باقی نہیں رہا تھا۔ اس میں ان کی صحت کے روز افزوں انحطاط اور اضمحلال طبع کو بھی دخل تھا، بالآخر انھوں نے ایک جلسہ میں ہم لوگوں کے عرض ومعروض کے باوجود صدارت سے استعفیٰ دیدیا، اور بالاتفاق آزاد مفتی صاحب صدر منتخب ہوئے، جن سے زیادہ اس پُر آشوب دور اور اختلاف خیال کی فضا میں کوئی اور شخصیت موزوں نہ تھی، اللہ تعالیٰ نے ان کو دو خاص امتیازی جوہر عطا فرمائے تھے، ایک ذہانت، دوسرے مختلف الخیال افراد اور

جماعتوں، اور بعض اوقات متضاد و متناقض رُجحانات میں مصالحت و مفاہمت کی کامیاب کوشش، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مولانا رُومؒ کی اس حکیمانہ وصیت پر پورا عمل تھا ؎ تو برائے وصل کردن آمدی : نے برائے فصل کردن آمدی

نیز خواجہ حافظؒ کے اس شعر پر بھی وہ پورے طور پر کاربند تھے ؎
آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است : با دوستاں تلطّف با دشمناں مدارا

بارہا اس کا تجربہ ہوا کہ مختلف نقطۂ نظر پوری خطابت اور زور استدلال کے ساتھ سامنے آئے، اور نظر آنے لگا کہ شاید آستینیں چڑھ جائیں۔ کہ مفتی صاحب کے چند فقروں نے اس جوش کو ٹھنڈا کر دیا۔ مختلف جماعتوں کو ساتھ لے کر چلنے کی جیسی صلاحیت ان میں دیکھی گئی، کم قائدین میں دیکھنے میں آئی ممکن ہے بعض "ماہرین نفسیات" اور ناقدین اس کو ان کی کمزوری اور ضرورت سے زیادہ بڑھی ہوئی خوش خلقی و مروّت پر محمول کریں، لیکن جب ملّت میں انتشار ہو مختلف جماعتیں اور مکاتب خیال کسی نہ کسی درجہ میں عصبیّت سے متاثر ہوں تو ایسی "مرنجان و مرنج"، حلیم و بردبار اور وسیع ہمہ شخصیت کی ضرورت شدت سے محسوس کی جاتی ہے، اور آج یہ خلا مفتی صاحب کے انتقال کے بعد نہ صرف مجلس مشاورت کے دائرہ میں (جس کا منصب صدارت ابھی تک خالی ہے) بلکہ ملّت کے دائرہ میں بھی محسوس ہوتا ہے۔

مضمون ختم کرنے سے پہلے اتنا عرض کرتا چلوں کہ مجلس کے طویل و وسیع دوروں میں میں دو باتوں کی خاص کوشش کرتا تھا، ایک یہ کہ قیام (علمی، دینی اور طبعی مناسبت کی وجہ سے) ہمیشہ مفتی صاحب کے ساتھ رہے، دوسرے نمازیں (خصوصاً جہری) انھیں کی امامت اور اقتدا میں پڑھی جائیں، اس لئے کہ مفتی صاحب کی تلاوت میں بڑی حلاوت تھی، وہ بھی رفقاء سفر میں مجھ پر خاص طور پر شفقت

فرماتے تھے، اور مانوس و بے تکلف تھے، اسی تعلق و محبت کی بنا پر میری درخواست پر ۱۹۷۶ء میں وہ رائے بریلی تشریف لائے اور واپس جاکر بڑی محبت کا خط لکھا جس کے لفظ لفظ سے خلوص و مسرت کا اظہار ہوتا ہے۔

مفتی صاحب کی محبت اور تعلق کی بات تھی کہ انھوں نے کئی بار مجھ سے فرمایا کہ تم اپنی کوئی تصنیف ندوۃ المصنفین کو دو، اور اس کی طرف سے اسکی اشاعت ہو ۱۹۸۰ء کی ابتدا کا کوئی مہینہ تھا، کہ تدکیسر گجرات میں محترمی مولانا غلام محمد صاحب نورگت کے دولت خانہ پر جن کا مفتی صاحب سے خاص تعلق تھا، اور میرے بھی بزرگ اور کرم فرما ہیں، اس کا ذکر آیا، اور میں نے اپنی کتاب سعیات عبد الحیی جو انھیں دنوں میں مرتب و مکمل ہوئی تھی۔ ندوۃ المصنفین کو پیش کرنے کا وعدہ کیا مفتی صاحب نے اس پر اپنی بڑی خوشی کا اظہار کیا اور بڑی توجہ اور اہتمام کے ساتھ وہ نومبر ۱۹۸۰ء میں ندوۃ المصنفین کی طرف سے شائع ہو گئی، مجھے بھی مفتی صاحب کی ایک خواہش و فرمائش کی تعمیل کی مسرت و سعادت اور کتاب کو ندوۃ المصنفین جیسے مؤقر تصنیفی ادارہ کی مطبوعات میں شامل ہونے کی عزت حاصل ہوئی، اور وہ الحمدللہ علمی ادبی حلقوں میں پسند کی گئی، مفتی صاحب کی اجازت سے ادارہ نشریات اسلام نارتھ ناظم آباد نے اس کا پاکستانی ایڈیشن بھی شائع کیا۔

مفتی صاحب اخیر میں چند شدید بیماریوں کا شکار رہے، لیکن مزاج میں جو مروّت اور للہیت، پرانے تعلقات کا پاس و لحاظ اور اخلاق و ایثار کا جوہر تھا وہ ضروری آرام و احتیاط میں بھی مخل ہو جاتا تھا، یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنے بہت سے قدیم عوارض اور جدید تکلیفوں کے باوجود دار المصنفین کے اس سمینار میں شرکت ضروری سمجھی جو اسلام اور مستشرقین کے عنوان پر ۲۶ - ۲۸ ربیع الآخر ۱۴۰۲ھ ۲۱-۲۳ فروری ۱۹۸۲ء کو دار المصنفین کی طرف سے اس کے زیر اہتمام

شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج اعظم گڑھ میں منعقد ہوا، اسی سفر سے واپسی پر دریا آباد کے اسٹیشن پر ان پر اچانک فالج کا حملہ ہوا، یہ انتظام غیبی تھا کہ مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی اور چند مخلص احباب و رفقاء خاص ہمسفر تھے، لکھنؤ کے طبی امداد کے اسٹیشن پر پہونچ جانے کی اطلاع کردی گئی، وہاں مفتی صاحب کو اتارلیا گیا، مفتی صاحب کے نیازمندوں اور ندوۃ العلماء سے تعلق رکھنے والے احباب وخدام نے اپنی ذمہ داری کا پورا احساس کیا، اور حصول سعادت اور خدمت کو غنیمت سمجھا، راقم سطور بھی لکھنؤ میں موجود تھا، وہ بھی اس سعادت میں شریک رہا، مفتی صاحب کو بلرام پور ہسپتال میں داخل کردیا گیا، دارالعلوم کے اساتذہ اور طلبہ نے دین وملت کے اس "ھما"، کی پذیرائی میں کوتاہی نہیں کی، جو قسمت سے اڑکر ان کے پاس پہونچ گیا تھا، خیال تھا کہ جب تک آرام نہ ہوجائے مفتی صاحب یہاں سے تشریف نہ لے جائیں، لیکن گھر والوں کا تقاضہ غالب آیا اور یہ خیال ہوا کہ ان کا حق زیادہ ہے اور شاید وہاں مفتی صاحب کو قلبی وروحانی سکون اور طمانیت ملے اس لئے بادل ناخواستہ یہ جدائی گوارا کی گئی، لیکن کچھ عرصہ کے بعد ہی وہ ساعت مقرر آگئی، جس کے متعلق فرمادیا گیا ہے کہ

لا یستأخرون ساعۃ ولا یستقدمون

اور نہ صرف ندوۃ المصنفین بلکہ وہ سب دینی ادارے جس کے وہ رکن مشیر اور معاون ورفیق تھے، نہ صرف دہلی جوان کا مسکن اور دیوبند جوان کا وطن تھا، بلکہ برصغیر ہند (ہندوستان وپاکستان) ان کی رہنمائی، اصابت رائے سلامت فہم، اور مختلف الخیال لوگوں میں وصل وجمع کی صلاحیت سے محروم ہوگیا، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

مفتی صاحب کے لئے تقدیر الٰہی میرے لئے توفیق وسعادت کی بات

تھی کہ مفتی صاحب کی وفات کا واقعہ پیش آیا تو میں حجاز مقدس میں تھا) مجھے دہلی کے ٹیلیفون سے اس کی بروقت اطلاع ملی، میں نے اسی وقت سعودی ریڈیو اسٹیشن سے رابطہ پیدا کیا اور عزیزی مولوی نصار رفیع ندوی انچارج شعبۂ اردو جدہ ریڈیو اسٹیشن کو اپنی قیام گاہ پر بلاکر مفتی صاحب کے حادثہ ارتحال اور ان کی شخصیت، خدمات وکمالات پر ٹاک ریکارڈ کرائی، جو اسی دن نشر ہوئی اور اسی کے ذریعہ حجاز مقدس اور سعودی عرب کے دوستوں اور اہل تعلق کو حادثہ کا علم ہوا مجھ سے جو کچھ بن آیا مفتی صاحب کے رفع درجات کے لئے دُعا اور طواف کی سعادت حاصل کی اور اپنے مخلص احباب کو بھی اس کی ترغیب دی۔ اندازہ ہے کہ بہت سے مخلصین نے یہ سعادت حاصل کی، اور مفتی صاحب کے لئے دُعا وطواف کے ذریعہ ایک جلیل القدر عالم اور خادم ملت کے لئے دعا اور ایصال ثواب کرکے اپنے لئے بھی قبولیت اور ترقی دینی کا سامان کیا، شاید کم مشاہیر وزعمار کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا ہو، کہ اس قدر جلد ان کے لئے دیار مقدسہ میں دُعائے مغفرت اور ایصال ثواب کا اہتمام ہوا ہو۔

وذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء